Volume 03, Issue 01,
January-March 2025
PP: 24-31
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

رشید امجد–غریب الوطنی کا نوحہ گر

Rāshid Amjad – The Lamenter of the Migration

Muhammad Farooq [1] *Imtiaz Akhtar* [2]

Article History

Received
08-01-2025

Accepted
28-01-2025

Published
31-01-2025

Indexing

Abstract

Rāshid Amjad is a renowned name in Urdū fiction. In the last quarter of the twentieth century, Rāshid Amjad succeeded in establishing his unique identity in modern and symbolic fiction. His first collection of fiction was published in 1974 under the name Bizār Ādam ke Bete. After that, fiction collections continued to come to the fore until 2007. This was a period of political instability, martial law, and repression in which the life of the common man was plagued by determinism, fear, despair, and suffocation. Rāshid Amjad made every walk of life the subject of his stories. This is why he has a diversity of topics. After 2007, his collection of fiction Dukh Ek Chiriya Hai was published by the National Book Foundation in 2016. Rāshid Amjad made new angles of life the subject of this collection. One of the important topics among them is migration. Rāshid Amjad describes the lament of migration in his stories well. He has highlighted the causes of distance from the homeland and its effects on the life of an individual. The real situations of helplessness of old parents due to the migration of their children are particularly visible in these stories.

This article brings to light the various forms of grief and sorrow caused by the separation of parents from their children. It highlights the sacrifices parents make for their children. The painful moments spent by parents are shown in a realistic manner. Economic instability and unemployment in the country have forced the new generation to emigrate. How lives are disrupted due to migration can be seen in Rāshid Amjad's stories. In this regard, awareness is given of the conditions such as closeness, distance, happiness, sadness, peace, and anxiety between parents and children. These stories seem to be Rāshid Amjad's personal observations.

Keywords

Urdu Fiction, Rasheed Amjad, Migration, Relationship, Pain, Anxiety, Old Age Issues.

[1] *PhD Scholar, Department of Urdu, NUML, Islamabad.*
kalyarfarooq@gmail.com
[2] *M Phil Scholar, Department of Urdu, FJWU, Rawalpindi.*

All Rights Reserved © 2023 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

رشید امجد اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ بیسویں صدی کے ربع آخر میں جدید اور علامتی افسانے میں رشید امجد اپنی منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۷۴ میں "بیزار آدم کے بیٹے" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ۲۰۰۷ء تک تواتر سے افسانوی مجموعے منظر عام پر آتے رہے۔ یہ دور سیاسی عدم استحکام، مارشل لا اور جبریت کا تھا جس میں عام آدمی کی زندگی جبر، خوف، مایوسی اور گھٹن سے دوچار تھی۔ رشید امجد نے ہر شعبہ ہائے زندگی کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ رشید امجد عام آدمی کے علمبردار ہیں۔ ان کی کہانیاں عام آدمی سے شروع ہوتی ہیں اور عام آدمی پر ختم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں

"رشید امجد کے افسانوں میں عام آدمی اور اس کے حالات و معاملات کی سرگزشت جس طور پر فوکس ہوئی ہے اسے اردو افسانے کی تاریخ میں بہت منفرد اور ممتاز کہنا عین حقیقت ہے"۔[1]

رشید امجد نباض افسانہ نگار تھے، انہوں نے نہ صرف سماجی بیماریوں کو منظر عام پر لایا بلکہ ان کے علاج کے نسخے بھی بتائے۔ وہ سماج کا عمیق نظری سے مشاہدہ کرتے ہیں اور عصری تغیر کو اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں۔ اکیسویں صدی کا آغاز انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ہوا تو ان کی کہانیاں نئے موضوعات کے ساتھ منظر عام پر آئی۔ اس ضمن میں انہوں نے فرد کی زندگی کی نئی صورتوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ۔صفیہ عبادر قمطراز ہیں کہ:

"رشید امجد کے موضوعات میں بڑی رنگا رنگی ہے۔ ذات، سماج اور کائنات۔ اس تکون میں موجود تقریباً ہر موضوع اور ہر فکری جہت کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔ ان کے بعض موضوعات میں انفرادی و اجتماعی طور پر ارتقاء کی ایک منفرد کیفیت ہے"[2].

۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۶ء تک رشید امجد زندگی کے مشاہدات اور تجربات میں گم رہے۔ ۲۰۰۷ء کے بعد ان کا افسانوی مجموعہ "دکھ ایک چڑیا ہے" ۲۰۱۶ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن سے شائع ہوا۔ رشید امجد نے اس مجموعے میں زندگی کے نئے زاویوں کو موضوع بنایا۔ ان میں ایک اہم موضوع "غریب الوطنی" ہے۔ رشید امجد اپنی کہانیوں میں غریب الوطنی کا نوحہ بہ خوبی بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے وطن سے دوری کے اسباب کے ساتھ فرد کی زندگی پر اثرات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ جو لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر اپنا ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک جا بستے ہیں؛ ان کے جانے سے ان کی اپنی ذات اور ان سے جڑے رشتوں پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؛ رشید امجد بہ خوبی اپنی کہانیوں میں اجاگر کرتے ہیں۔ بوڑھے والدین کی بے سہارگی اور بے بسی کی حقیقی صورتیں ان افسانوں میں خصوصی طور پر نظر آتی ہیں۔ والدین پر بیٹے لمحوں کی دردنا کی ایسے بیان کی گئی ہے جیسے حقیقی زندگی کی فلم چل رہی ہو۔ جدید دور میں اپنے ملک سے دوسرے ملک جانا آسان نہیں، لیکن ملکی حالات کی بدولت لوگ ایسا کرنے پر مجبور و مقہور ہیں۔ غریب الوطنی کی وجہ سے زندگیوں میں کیسے بھوچال آتا ہے؛ رشید امجد کے افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں والدین اور اولاد کے مابین قربت، فاصلے، خوشی، غم، سکون اور پریشانی جیسی کیفیات سے آگاہی ملتی ہے۔ نئی نسل کی ترجیحات بدل رہی ہیں۔ آج کا نوجوان ترقی یافتہ ملک جانے کے خواب سجائے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال لوگوں کی بڑی تعداد آبائی ملک چھوڑ رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے جائز، ناجائز ہر قسم کے طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ اس کے اسباب و محرکات کیا ہیں اور اس مسافرت کے اثرات کیا ہیں، رشید امجد نے اپنی کہانیوں میں اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر عذرا لیاقت ترک وطن کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"ترک وطنیت یا ترک سکونت کی خواہ کوئی بھی وجہ ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وطن اور اپنوں سے دوری نے تارکین وطن کو ذہنی خلفشار، نفسیاتی الجھنوں اور پیچیدگیوں میں مبتلا کر دیا"۔[3]

غریب الوطنی کے لغوی معنی "وطن سے علیحدہ ہونا" ہیں۔[4] اصطلاحی معنوں میں آبائی ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک رہائش پذیر ہونا غریب الوطنی کہلاتا ہے۔ آبائی وطن سے دوری انسانی رشتوں اور زندگی کی رنگارنگی پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اس عمل سے بہت سی زندگیوں کی خوشیاں قربان ہو جاتی ہیں۔ بیرون ملک سفر کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، رشید امجد اپنی کہانیوں میں ان وجوہات کو پیش نظر رکھتے ہوئے غریب الوطنی کا گریہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے خاص فن اور اسلوب کے ذریعے ملک کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات سے پردہ چاک کرتے ہوئے وطن سے دوری کے محرکات سامنے لاتے ہیں۔ رشید امجد کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے غریب الوطنی کے زیر اثر کئی پہلوؤں کو منظر عام پر لایا ہے۔ انہوں نے بظاہر خوش اور آرام دہ نظر آنے والی زندگی کی اصل پرت سے پردہ چاک کیا ہے جس کے پیچھے کئی دکھ، درد اور رنج موجود ہیں۔ ان افسانوں میں بالخصوص والدین کی حقیقی تڑپ کو دکھایا گیا ہے۔ قاری ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے ایسے محسوس کرتا ہے جیسے وہ خود ان کہانیوں کا کردار ہو۔ "شام کہانی" میں والدین کی بے بسی کو عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں تمام بیٹے ایک ایک کر باہر جانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے دوست سے اس پریشانی کا ذکر کرتا ہے لیکن اسے سوائے چپ رہنے کے کوئی حل نظر نہیں آتا۔

> "دوست چند لمحے چپ رہا پھر بولا۔۔۔ "ہمیں حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے۔ اپنے بچوں کے مستقبل کو قربان نہیں کرنا چاہیے اور پھر یہ کوئی نئی بات نہیں، کون ہے جسے موقع ملے اور وہ باہر نہ جائے"۔
>
> اس نے اثبات میں سر ہلایا۔[5]

"شام کہانی" ماں باپ، بچوں اور اپنے گھر سے محبت کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں رشتوں کی سرد مہری کو سامنے لایا گیا ہے۔ رشید امجد نئی نسل کی ترجیحات اور بوڑھے والدین کے تحفظات کو ساتھ ساتھ پیش کرتے ہیں۔ نئی نسل بیرونِ ملک اپنے مستقبل کی فکر میں سرگرداں ہے اور ان کا محور وطن واپسی نہیں بلکہ بیرون ملک مستقل سکونت ہے۔ ملکی معاشی عدم استحکام، بے روزگاری اور عدم اطمینان نے نوجوان نسل کو ہجرت پر مجبور کر دیا ہے۔ اس وقت پاکستان کی کثیر تعداد بیرون ملک مقیم ہونے کی خواہاں ہے۔ رشید امجد اس عمل کو دو زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ ایک والدین کی تنہائی، بے بسی دوسرا اولاد کا اپنے والدین کے لیے فکر مند ہونا۔ یہ المیہ پاکستانی سماج میں پایا جاتا ہے۔ والدین کے لیے بیرون ملک کی زندگی اذیت کا باعث بنتی ہے۔ ان کے لیے نیا سماج قبول کرنا بہت مشکل ہے۔ نئے طرز زندگی کو اپنانا آسان نہیں ہوتا، اپنے وطن کی ثقافت، سماجی میل جول سے دوری فرد کو داخلی اور خارجی ہر دو سطح پر متاثر کرتی ہے۔ رشید امجد "جاتی رُت کے خواب" میں پردیس کی زندگی کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "اور اب عمر کے اس آخری حصے میں یہ چھوٹا سا کمرہ اور زندگی بھر کے پچھتاوے میرا مقدر ہیں۔ طوطوں کی طرح،
> غراتی بلی کو دیکھ کر گھڑے میں چھپ جانا۔
> شام کو بیٹا بہو اور بچے آتے تو بیٹا پوچھتا۔ "سارا دن کیا کرتے رہے؟'
> وہ کیا جواب دیتا، اداسی سے کہتا۔ بس ایک دن اور گزر گیا"۔[6]

غریب الوطنی کے باعث زندگی کی بدلتی صورت حال ان افسانوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ جیسا کہ رشید امجد نے یہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی کہ بیرون ملک رہائش گاہیں بوڑھے والدین کو قید خانہ لگتی ہیں جب کہ نئی نسل اسے جدید زندگی تصور کرتی ہے۔ والدین بلند و بالا اور بند گھروں میں گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ وہ آبائی وطن میں پڑوسیوں سے میل جول کو یاد کرتے ہیں، جو انہیں بیرون ملک میسر نہیں ہے۔ رشید امجد بڑھاپے کی کمزوریوں کو دردناک انداز میں سامنے لاتے ہیں، سب سے بڑی کمزوری والدین کے جوان بچوں کا خود مختار ہونا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ

زندگی کے فیصلوں میں والدین کو شریک نہیں کرتے۔ لیکن والدین اپنی حصے کی خوشیاں، سکون اور خواہشات کو بچوں پر قربان کر دیتے ہیں۔ رشید امجد نے بڑھتے ہوئے جنریشن گیپ کو بہ خوبی اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا ہے۔ صفیہ عباد لکھتی ہیں کہ

"اسی ٹوٹتے ہوئے نظام کا ہی شاخسانہ ہے کہ گھر کی چار دیواری میں محبتوں اور جذبوں میں بندھے ہوئے رشتے بھی ٹوٹ رہے ہیں۔ کہیں وقت کی مجبوری، حالات کی معذوری۔ گھر کی دہلیز سنسان ہو رہی ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام تلاش روزگار کی بہانہ جوئی میں گھر کی چوکھٹ بانٹ رہا ہے۔ یہ رشید امجد کی کہانی کا وہ سچ ہے جو ہر گھر کی کہانی اور اس کے در و دیوار کی سنسانی کا نقشہ پیش کر رہا ہے"۔[7]

رشید امجد کے افسانے "تصویریں اور دیواریں" میں والدین اور اولاد کی ترجیحات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ بچے ایک ایک کر کے اپنی بیویوں کو ساتھ لے کر بیرون ملک شفٹ ہو جاتے ہیں۔ جب کہ بوڑھے والدین اپنا وطن چھوڑنے پر رضامند نہیں۔ اولاد اس احساس سے عاری ہے کہ ان کے بوڑھے والدین کیا خواہش رکھتے ہیں۔ بچوں کے لیے اپنا مستقبل عزیز ہے جو اپنے وطن کی بجائے دوسرے ممالک میں روشن ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس سے بہت سے مسائل جنم لے رہے ہیں۔ رشید امجد نے افسانے کے آخر میں بے بسی، درد اور کرب کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

"بیٹے نے کہا۔ "آپ لوگ بھی چلیں، یہاں اکیلے کہاں رہیں گے"

اُس نے بیٹے کی طرف دیکھا اور آہستہ بولا۔ "بیٹا وہاں تو لوگ بھی گونگے ہیں اور یہاں دیواریں بھی باتیں کرتی ہیں"۔

بیٹے کو یہ بات سمجھ نہ آئی۔ بولا۔ "تو یہاں آپ کے پاس کون ہو گا۔

اُس نے دیوار پر لگی بیٹوں اور ان کے س بچوں کی تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" ہمارے پاس یہ تصویریں ہیں"۔[8]

رشید امجد اپنوں سے دوری کا دکھ بہت شدت سے بیاں کرتے ہیں۔ وہ ان فاصلوں کو موبائل فون اور جدید آلات کی مدد سے سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ نواسوں اور پوتوں سے ویڈیو کال بھی ان کے درد اور انتظار کو ختم نہیں کر سکتی۔ رشید امجد نے نئی نسل کی خواہشات اور ترجیحات کو عمدگی سے منظر عام پر لایا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو دورِ حاضر میں نوجوان نسل کی یہی خواہشات ہیں کہ وہ بیرون ملک اپنا مستقبل بنائے۔ اس کے لیے مختلف قسم کے طریقہ اختیار کیے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی قابلیت پر بیرون ملک جاتے ہیں اور کچھ لوگ بیرون ملک مقیم عورتوں سے شادی کر کے جاتے ہیں۔ بنیادی مقصد اپنے وطن کو چھوڑنا ہوتا ہے۔ بیرون ملک مستقل سکونت کا خواب ہر نوجوان دیکھ رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے بہت سے لوگ بیرون ملک بالخصوص یورپ، امریکہ، کینڈا اور آسٹریلیا میں شادی کر کے مستقل سکونت اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رشید امجد "گماں کے رشتے" میں والدین اور اولاد ہر دو کی صورت حال کو سامنے لاتے ہیں۔ جس میں والدین کی بے بسی، بے سہارگی، تنہائی اور اولاد سے دوری کا دکھ شامل ہے جب کہ دوسری جانب اولاد کی خود غرضی اور احساس کی کمی کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔

"۔۔۔بیوی کو اب بیٹے کے بیاہ کی فکر لگ گئی۔ بیٹے نے بہن سے کہا کہ میرے لیے بھی کوئی باہر کا رشتہ تلاش کرو تا کہ مجھے وہاں کی نیشنلٹی مل جائے۔ اس نے سنا تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بیوی سے کہا۔ 'یہ بھی۔۔۔"

بیوی چپ رہی

ہمارے ساتھ کون ہو گا؟

بیوی پھر بھی چپ رہی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیٹے کی شادی باہر ہو لیکن بیٹے نے صاف صاف کہہ دیا۔ "مجھے آگے پڑھنا ہے میرا کیئریر ہے یہاں کیا رکھا ہے"۔

۔۔۔رشتہ مل گیا، لڑکی والے آئے، بیٹے کو بیاہ کر ساتھ لے گئے اب دونوں میاں بیوی اکیلے تھے"۔[9]

اپنوں سے دوری اور بالخصوص اپنی اولاد سے دوری برداشت کرنا بہت مشکل امر اور جان لیوا عمل ہے جس میں والدین لمحہ بہ لمحہ مرتے رہتے ہیں۔ماں اپنی ممتا کو اندر ہی اندر دبائے رکھتی ہے۔والد بظاہر مضبوط نظر آتا ہے لیکن اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے۔رشید امجد کے افسانوں سے لگتا ہے کہ انہوں نے اندر جھانک کر سب کچھ دیکھتے ہوئے ان افسانوں کو قلم بند کیا ہے۔ان کے کردار، مکالمے، گفت گو سب حقیقی منظر پیش کرتے ہیں۔یہ ان کا منفرد اسلوب ہے جس سے قاری کہانی کو اپنی کہانی سمجھتا ہے۔ہمارے ملک میں روز بروز بڑھتی مہنگائی، بے روز گاری اور معاشی عدم استحکام نے لوگوں کو وطن سے دوری پر مجبور کر دیا ہے۔رشید امجد نے اپنی کہانیوں میں بیرون ملک زندگی کی مشکلات کو بھی اجاگر کیا ہے۔ مشینی طرز کی زندگی، بھاگم بھاگ، دن رات میں کوئی تفریق نہیں جیسی صورت حال ان کے ہاں عموماً ملتی ہے۔"مٹی کی مہک" میں وہ لکھتے ہیں:

"پھر یوں ہوا کہ اچھے روز گار کی تلاش میں وہ اپنے ملک سے نکل کر یہاں آ گئے۔ہاتھ تو کھل گیا لیکن دل بند ہونے لگا۔ماں کبھی کبھی سوچتی کہ اپنے یہاں ہوتی تو دس لوگ بیٹی کی شادی کی طرف متوجہ کرتے لیکن یہاں کون تھا اور کسی کو کیا پڑی تھی، یہاں تو یہ بھی معلوم نہیں کے ساتھ والے فلیٹ سے جو جوڑا روز صبح نکلتا ہے میاں بیوی بھی ہیں یا صرف ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہیں۔یہاں کوئی سلام کا بھی روادار نہیں۔لوگ ایک دوسرے سے بچنے اور دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں"۔[10]

رشید امجد کے ہاں رشتوں کی بہت قدر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کرداروں کی شناخت ناموں کی بجائے رشتوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً باپ، ماں، شوہر، بیوی، نواسے، پوتے۔انہوں نے رشتوں کی پامالی کا دکھ، تکلیف نہایت شدت سے بیان کیا ہے۔اپنے ملک اور غیر ملک میں رشتوں کے مابین فرق کو بہ خوبی نمایاں کیا ہے۔بیرون ملک میں اپنی اپنی زندگی میں مگن لوگ اپنوں کو بھی بھول جاتے ہیں، اس لاپرواہی کو رشید امجد نے ایک المیہ قرار دیا ہے۔ان کے ہاں زندگی کی خوب صورتی رشتوں میں اپنائیت کی نسبت ہے جو بیرون ممالک میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ رشید امجد وطن سے دوری برداشت نہیں کر سکتے۔انہیں اپنے وطن کی یاد، مہک، لوگ سب یاد آتے ہیں اور وہ واپس جانے کی بے تابی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے لیکن اولاد واپسی کے دروازے بند کر دیتی ہے اور جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ رشید امجد خاص اسلوب کے تحت خاص بات کو روزمرہ معمولات زندگی میں کہہ جانے کا فن جانتے ہیں۔جیسا کہ "مٹی کی مہک" میں لکھتے ہیں:

"ایک دن باپ کی خاموشی ٹوٹ گئی، صبح ناشتہ کرتے ہوئے اس نے کہا" ہم نے کافی پیسے جمع کر لیے ہیں، واپس کیوں نہ چلیں؟"

لگا جیسے کائی زدہ تالاب میں کسی نے بڑا پتھر پھینک دیا ہو،

آنکھوں میں چمک سی آئی لیکن اگلے ہی لمحے وہی پتھراؤ، بڑے بیٹے نے کہا۔ ہمیں تو اب یہاں کی شہریت ملنے والی ہے

بیٹی بولی۔"میں تو کبھی نہ جاؤں۔

۔۔۔باپ کا دل مسوس ہو کر رہ گیا، آنکھیں نم ہو گئیں اگر میری ڈیتھ ہو گئی تو مجھے گاؤں لے جانا۔[11]

ان کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ ترتیب اور تسلسل سے زندگی کا احوال بیان کرتے ہیں۔ اپنی محنت، شادی، بچوں کی پرورش اور پھر ان کی شادیوں تک کا سفر انتہائی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب جوان اولاد اپنے فیصلے خود کرنا شروع کر دیتی ہے اور والدین کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بیرون ملک منتقل ہو جاتی ہے۔ ایک شخص جس نے اپنی زندگی کا تمام سفر اپنی بیوی اور بچوں کی خاطر قربان کیا ہوتا ہے، لیکن اس کا صلہ جدائی کے کرب کی صورت میں ملتا ہے۔ اگر والدین باہر شفٹ ہو بھی جائیں تو ان کی روح اپنے وطن اور گھر میں ہی رہ جاتی ہے۔ ان کے ہاں ارتقائی سفر نشیب و فراز کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ رشید امجد "پرندہ اداس ہے" میں لکھتے ہیں۔

"کیا دن تھے؟..... اب سوچتا ہے تو چاروں طرف رائیگاں کی دھول اڑتی محسوس ہوتی ہے، اچھے دن انھیں اداس دنوں میں بدلتے دو تین سال ہی لگے۔ بیٹیوں کو ان کے شوہر بیرون ملک لے گئے۔ بیٹے شادیاں کر کے ایک ایک کر کے خود باہر چلے گئے۔ اب یہ چھ کمروں کا گھر دو اکیلے بوڑھے میاں بیوی اور ان ہی طرح کا بوڑھا ملازم"۔[12]

ان افسانوں میں صرف مسافرت بیان نہیں ہوئی بلکہ اولاد کی بے حسی بھی شامل ہے۔ جو اپنے بوڑھے والدین کو عمر کے ایسے حصے میں تنہا چھوڑ گئے ہیں، جب انہیں سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ یہ کیسا دور آ چکا ہے کہ اپنے ہی اپنوں سے بیگانے ہو چکے ہیں۔ سگے رشتوں میں اجنبیت شامل ہو چکی ہے۔ قربت کا احساس زنگ آلود ہو رہا ہے۔ زندگی کی چاشنی کڑواہٹ میں بدل چکی ہے۔ مادیت پرستی دیمک کی طرح اپنائیت کو چاٹ رہی ہے۔ رشید امجد علامتی اسلوب میں بھی اپنے گھر، اشیا، ماحول سے دوری کو بہ خوبی بیان کرتے ہیں۔ "طوطے کی موت" ایک علامتی کہانی ہے جس میں تنہائی اور گھٹن موت کا سبب بنتی ہے۔ یہ افسانہ فرد کی داخلی کشمکش کو اجاگر کرتا ہے اور یہ کشمکش اپنا گھر چھوڑ کر دوسرے ملک جانے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

اب اصرار بڑھنے لگا، بیٹا روز ایک ہی بات دہراتا۔ "پاسپورٹ بنوائیں۔"
چاہتے نہ چاہتے پاسپورٹ بن گئے، کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے ہی ویزے اور ٹکٹ آ گئے۔
اب جانا ٹھہر گیا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔
گھر بھر کی چیزوں کو سمیٹنا اتنا آسان نہیں تھا۔ پڑوسی اچھے تھے۔ انہوں نے تسلی دی۔ "چلے جاؤ، دل نہ لگا تو واپس آ جانا۔"
اور یہ گھر۔ یہ سب کچھ۔ "وہ رونے والا ہو گیا۔[13]

بیرون ممالک میں رہائش پذیر افراد کی مشکلات کو بھی رشید امجد نے عمدگی سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے "موسم بہار میں سوکھی ٹہنیاں" میں ایک خاندان کی دردناک کہانی بیان کی ہے۔ اس کہانی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کچھ ممالک کے قانون و ضوابط اس قدر سخت ہیں کہ ان سے انحراف کرنے کی سزا موت ہے۔ ایک شخص ایسی عورت سے شادی کر لیتا ہے جو غیر قانونی طور پر رہائش پذیر ہے۔ اس بنا پر ان کا نکاح رجسٹر نہیں ہوتا اور نہ ہی شادی کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوتی ہے، جس کا اندراج بھی وہ نہیں کروا سکتے۔ اس ضمن میں وہ نہ تو اپنے آبائی ملک واپس آ سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی شادی شدہ زندگی کو قانونی طور پر وہاں گزار سکتے ہیں۔ عرب ممالک میں کفیل کے زیر قبضہ پاسپورٹ فرد کے لیے بہت مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ فرد ایک طرح سے کفیل کی قید بامشقت میں پابند سلاسل ہو جاتا ہے۔ غریب ممالک سے آئے لوگ چھوٹی چھوٹی وجوہات کی بنا پر کفیل کے ظلم و ستم کا شکار ہوتے ہیں، ان کے پاس وہاں سے بھاگنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا کرنا بھی ان کے لیے مزید کئی مشکلات کا باعث بنتا ہے۔

"جس دن بچی پیدا ہوئی اسی رات میں اسے ہسپتال لے گیا" وہ ایسے بول رہا تھا جیسے سامنے لکھی کوئی تحریر پڑھ رہا ہو... اتفاق سے ڈیوٹی نرس بھی بنگالن تھی، جانتی تھی، کہنے لگی۔۔۔ بچی کو لے کر فوراً یہاں سے نکل جاؤ، ورنہ صبح کاغذات مانگے جائیں گے تو دونوں پکڑے جاؤ گے اور حدود کا مقدمہ بن جائے گا"۔[14]

رشید امجد جدید سماج کے تغیر و تبدل کے شاہد ہیں۔ انہوں نے فرد کی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے خاندانی عمارت کو زمیں بوس ہوتے دکھایا ہے۔ یہ عمارت جسے باپ بہت محنت، تگ و دو اور لگن سے استوار کرتا ہے تاکہ ان کا بڑھاپا آسان گزرے، لیکن جدید نسل والد کی طویل محنت کو پل بھر میں فراموش کر دیتی ہے۔ اس طرز زندگی کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے۔ جس سے خاندانی نظام زندگی مفلوج ہو گیا ہے۔ رشتوں کی رسی کمزور ہو رہی ہے۔ ان حالات کو رشید امجد نے بہت خوب صورتی سے قلم بند کیا ہے۔ رشید امجد خود سے کیے گئے سوال: کیا فاصلے معنی رکھتے ہیں؟ کا جواب تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ کبھی اس سوال کا جواب انٹرنیٹ کی سہولت سے حاصل کرتے ہیں اور کبھی وہ غریب الدیاری کی صورت میں تلاش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں اس کا جواب صحیح معنوں میں نہیں ملتا۔ وہ خاندان کی مضبوطی اور بقا کے قائل ہیں۔ رشید امجد انسان کے انسان سے بندھن تک اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک گھر، چیزیں، ماحول سب ایک رشتے میں پیوست ہوتے ہیں جنہیں خود سے دور کرنا انتہائی مشکل ہے۔ "طوطے کی موت" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں رشید امجد بیرون ملک رہائش پذیر اولاد اور اپنے گھر کی محبت میں بٹے ہوئے ہیں۔ وہ دونوں کو خود سے دور نہیں کر سکتے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کچھ دیر کے لیے دل مچل جاتا، جی چاہتا اڑ کر ان کے پاس پہنچ جائے لیکن پھر گھر کا لمس اور مہک اسے اپنے اندر سمیٹ لیتی۔ بیوی بھی ڈانواں ڈول تھی، کبھی تیار ہو جاتی کبھی کہتی اپنا گھر چھوڑ کر کون جاتا ہے"۔[15]

یہ افسانہ رشید امجد کی عمدہ تخلیق ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان اپنے گھر اور چیزوں سے بھی اولاد کی طرح محبت کرتا ہے۔ ان سے دوری کا دکھ بھی ویسا ہی ہے جیسا اولاد سے دوری کا۔ رشید امجد جذبات و احساسات کو زندگی کے ہر زاویے سے پرکھتے ہیں۔ یہ ایسا درد ہے جو والدین دوسروں سے بانٹ بھی نہیں سکتے۔ اپنی اولاد سے دوری کا غم، یا پھر اپنے گھر سے دوری کا دکھ، دونوں صورتوں میں فرد کرب سے دوچار ہوتا ہے۔ مجبوری کے عالم میں ایک کی دوری برداشت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اندر اندر فرد زخمی ہو جاتا ہے۔ "طوطے کی موت" میں رشید امجد علامتی پیرائے میں جذباتی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ یہ کہانی ایسے شخص کی ہے جو اپنے بچوں کے اصرار پر ان کے پاس بیرون ملک چلا جاتا ہے۔ لیکن اسے جہاز میں یہ خیال آتا ہے کہ اس کا طوطا گھر میں رہ گیا ہے اور اسے وہ کسی کے حوالے نہیں کر سکا۔ طوطے کو بے یار و مددگار چھوڑ کر آنا اس کے لیے ناقابل برداشت امر ہے۔ لیکن بیوی اور بچوں کی ضد نے اسے واپس جلد نہ آنے پر مجبور کیا ہوا ہے۔ زیر نظر افسانوی مجموعے "دکھ ایک چڑیا ہے" کے افسانوں کے حوالے سے ڈاکٹر انوار احمد رقمطراز ہیں کہ:

رشید امجد کے نئے افسانوں میں گھر کی ویرانی ایک ملال انگیز تجربہ بن کر سامنے آتی ہے اس میں گھر چھوڑ کر چلے جانے بچوں کی جگہ پرندے اور فالتو جانور لیتے ہیں مگر انہیں بھی یا زندہ نہیں رکھا جاتا یا اُداس اور دکھی ہونے سے نہیں بچایا جا سکتا"۔[16]

رشید امجد نے اپنی کہانیوں میں ماں باپ کے کرب کے ساتھ اولاد کا اپنے والدین کے لیے لگاؤ بھی بیان کیا ہے۔ لیکن وہ یہ باور کراتے ہیں کہ اولاد کی ترجیحات والدین سے مختلف ہیں۔ اولاد اپنے والدین کو بیرون ملک ساتھ رکھنے کی خواہاں ہے لیکن والدین اپنی مٹی، اپنا وطن چھوڑنے کو ترجیح نہیں دیتے۔ ان کے لیے اپنا گھر، چیزیں سب اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ ایسی کشمکش ہے جس میں دکھ اور کرب والدین کے حصے میں زیادہ آتا ہے۔ بچوں کی طرف سے لاپرواہی، لاتعلقی اور مشینی زندگی میں مگن رویوں کو بھی بہ خوبی بیان کیا گیا ہے۔ وہ اپنے حصول روزگار میں

والدین کی خدمت کو بھول رہے ہیں۔ یہ المیہ ہمارے ملک میں بڑھ رہا ہے۔ نوکروں کے رحم و کرم پر بوڑھے جسموں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ رشید امجد مادیت پرستی کے نشے کو ایک لعنت قرار دیتے ہیں جس میں اپنوں کو بھی فراموش کر دیا جاتا ہے۔ والدین پوری زندگی محنت مشقت سے گھر بناتے ہیں، بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں تاکہ ان کی آخری عمر سکون سے گزرے لیکن جدید دور میں بچے ان کی خدمت کی بجائے اپنے مستقبل کو سنوارنے میں مصروف عمل ہوتے ہیں۔ بیرون ممالک شادیاں کر کے واپسی پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ یہ کہانیاں ہمارے سماج کا کڑوا سچ ہیں۔ رشید امجد رشتوں کی مضبوطی کے قائل ہیں۔ غریب الوطنی کا نوحہ انہوں نے بہت کرب، درد اور چیخ چیخ کر بیان کیا ہے جس میں والدین کی سسکیوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات:

[1] شفیق انجم، ڈاکٹر، **رشید امجد-ایک مطالعہ**، (راولپنڈی: نقش نگر، 2009ء)، ص116

[2] صفیہ عباد، **رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ**، (اسلام آباد: پورب اکادمی، 2007ء)، ص333۔

[3] عذرا لیاقت، ڈاکٹر، **پاکستانی اردو افسانے میں ترک وطن کا اظہار**، (لاہور: فکشن ہاوس 2024)، ص36۔

[4] نور الحسن نور، **نور اللغات**، جلد سوم، (لکھنو: حلقہ اشاعت لکھنو، س ن)، ص543۔

[5] رشید امجد، **دکھ ایک چڑیا ہے**، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2016ء)، ص139۔

[6] ایضاً، ص105۔

[7] صفیہ عباد، **مشمولہ رشید کا نیا افسانوی مجموعہ۔ "دکھ ایک چڑیا ہے" مطالعہ و تجزیہ**، (الماس۔ تحقیقی جرنل 20)، ص100۔

[8] رشید امجد، **دکھ ایک چڑیا ہے**، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2016ء)، ص94۔

[9] ایضاً، ص146۔

[10] ایضاً، ص130۔

[11] ایضاً، ص131۔

[12] ایضاً، ص187۔

[13] ایضاً، ص206۔

[14] ایضاً، ص221۔

[15] ایضاً، 206۔

[16] انوار احمد، ڈاکٹر، **اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ**، (ملتان: کتاب نگر، 2017ء)، ص593۔